ڈاکٹر انعام الحق کوثر
سابق ناظم تعلیمات ادارہ نصابیات و مرکز توسیع تعلیم، بلوچستان، کوئٹہ

بلوچی ادب

تاریخی واقعات اور بلوچی روایات متفق ہیں کہ بلوچ قبائل میر جلال خاں کے زیر سرکردگی بارھویں صدی عیسوی میں مکران وارد ہونے شروع ہوئے۔ وہ کم و بیش پانچ چھ سو سال تک شمالی و مغربی اور جنوبی و مشرقی ایران کے درمیان گھومتے رہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان بلوچی پر اس وقت کی فارسی (جواوستا کی بگڑی ہوئی شکل تھی) اثر انداز ہوئی۔

بلوچستان میں ورود کے بعد مکران بلوچ قوم کا گہوارہ بنا۔ گو مرور زمان اور سیاسی مواقع کی بنا پر ان کی اکثریت یہاں سے قلات، سبی اور کچھی ہوتی ہوئی سندھ و گجرات اور پنجاب و سرحد کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں اُن کی مخصوص زبان محفوظ نہ رہ سکی لیکن اُن کے کچھ قبائل مستقلاً مکران میں بھی سکونت پذیر رہے۔ یہ علاقہ چونکہ جنوبی ایران سے ملحق ہے بلکہ مکران ہی کا کچھ حصہ جنوبی ایران میں بھی واقع ہے۔ اس لیے جب فارسی قوت و شوکتِ اسلام کی حامل ہو کر نکلی اور ایک نئے عروج و صعود سے آشنا ہوئی تو مکرانی بلوچی زبان پر بھی لازماً اس کے اثرات مرتب ہوئے۔

مشرقی علاقوں کی بلوچی پر فارسی کی بجائے ہم سایہ زبانوں سندھی اور سرائیکی کا اثر ہے۔ خاص طور پر سندھی کا تو بہت زیادہ اثر ہے۔

بلوچی ادب کا مغربی یا مکرانی مکتب جو ملا فاضل رند الملقب بہ ''غالب مکران مُلا قاسم رند، مُلا رگام وشی رزم نگار اور مُلا عزت پنجگوری غزل گو و رومان نگار سے منسوب ہے، خصائص ذیل کا مالک ہے:

۱۔ متقدمین کے برعکس اس کے شعرا فوراً اپنا مدعا بیان نہیں کرتے تھے بلکہ حمد و نعت و منقبت کے بعد اصل مقصد کی نقاب کشائی کرتے تھے۔

۲۔ متقدمین کے برعکس یہ شعرا اپنی نظم کبوتر یا عقاب کو مخاطب کر کے شروع نہیں کرتے تھے۔

۳۔ متقدمین کے برعکس ان کی زبان پر عربی خصوصاً فارسی الفاظ و محاورات غالب ہیں۔

لیکن اس مکتب نے بلوچی اندازِ نگارش میں جادہ ہائے نو تراش کر متاخرین کے لیے چھوڑے اور اُن کی توجہ ایک سماجی شعور پر مرکوز کی۔ مُلا فاضل کا ایک شعر ہے:

غم خیال ءِ وعاشقی چاڑءِ
ای دِگر شغل ءِ آ دِگر کار ءِ

(غم خیالات بلکہ تفکرات کے تسلسل کا نام ہے، عاشقی ایک خواہشِ ناتمام ہے اور یہ دونوں اشغال ایک دوسرے سے مختلف ہیں)

ملا عزت بن للہ نے ایرانی بلوچستان کی بلوچ حسینہ مہرجان معروف بہ مہرک بنت سامک کا مرثیہ لکھا ہے:

من عاشق ءِ خدایاں — پردین ءِ مصطفیٰ یاں
عزت بن ءِ للہ یاں — چوشہ مرید جلایاں
کچکول عصا ءَ زیراں — چوکابل ءِ فقیراں
ٹکڑ گدائی پنڈاں — من مہرک ءِ نہ گنداں

(میں خدا کا عاشق ہوں، دین، مصطفوی پر فدا ہوں، میں عزت ابن للہ ہوں، میں شاہ مرید کی طرح دل سوختہ ہوں، عصا اور کشکول لے کر کابل سے آئے ہوئے فقیروں کی طرح در در گھومتا پھرتا ہوں لیکن مجھے مہرک نظر نہیں آتی) مُلا رگام وشی کہتا ہے:

اگر قاروں بہ موسیٰؑ مہرباں بُت — پلنگ ءِ اُشترانی پاسباں بُت
شپ ءِ بست و نہم گرما ہکاں بُت — اگر آتش گوں پنبہ ہم لساں بُت
درو کیس گرگ ناہواں بساں بُت — زر ءِ ماہی پہ ڈن و ہم تجان بُت
مگر گڈامنی صلح و تران بُت

(اگر قارون موسیٰؑ پر مہربان ہوسکتا ہے، اگر چیتا اونٹوں کا پاسبان ہوسکتا ہے، اگر انتیسویں رات چاند رات ہوسکتی ہے، اگر آگ اور روئی اکٹھے ہو سکتے ہیں، اگر بھیڑیا بکریوں کا نگہبان ہوسکتا ہے اور اگر مچھلی چٹیل میدان میں تیر سکتی ہے تو پھر میں بھی اپنے دشمن کے ساتھ صلح و آشتی کر سکتا ہوں)

ان اشعار سے فارسی اثر اظہر من الشمس ہے۔ یہ ناگزیر تھا اور اس کے تحت بلوچ اپنے قبائلی وجود سے نکل کر ملی شعور کی پنہائیوں سے آشنا ہوتے تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے علامہ اقبال نے اسی ملی شعور میں شاعری کرنے کے لیے اُردو کے بجائے فارسی میں لکھنا شروع کیا اور اُن کی اُردو پر بھی فارسی کی نمایاں چھاپ تھی۔

فارسی اس خطے کی سرکاری زبان بھی رہی۔ ریاست قلات میں تو ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ تک دربار میں فارسی ہی کا راج تھا۔ یہاں اب تک مساجد میں ابتدائی تعلیم اسی زبان میں دی جاتی ہے۔ یہاں فارسی کے متعدد نامور شعراء گزرے ہیں۔ رابعہ خضداری جو رودکی کی ہم عصر تھی، اسی سرزمین سے متعلق تھی۔ ان نامور شعراء میں سے چند ایک برا ہوئی، بلوچ اور پٹھان شاعر فارسی کے جید عالم بھی تھے۔ اُن میں قاضی نور محمد گنج آبوی، ناطق مکرانی، پیر محمد کاکڑ، مُلا محمد حسن براہوئی، اخوندزادہ عبدالعلی، مُلا فاضل، یوسف عزیز مگسی، مولانا محمد یعقوب، مرزا احمد علی، علیم اللہ علیم، زیب مگسی وغیرہ خاص طور پر شہرت کے مالک ہیں۔

پروفیسر انور رومان مُلا رگام وشی کے انداز میں "ایک بلوچ کا جوہر" یوں بیان کرتے ہیں:

اگر سورج چمکنا چھوڑ سکتا ہے،
اگر بادل گرجنا بھول سکتا ہے،
اگر بجلی اندھی ہوسکتی ہے،
اگر پرندے چہکنا
اور پھول مہکنا بند کر سکتے ہیں،
اگر ہرن رینگ سکتے ہیں،

اگر ناگ ڈسنے سے باز رہ سکتے ہیں،

——— تو میں بھی ———

اپنی جانبازی ترک کر سکتا ہوں!

مسٹر ایم۔ ایل ورتھ ڈیمز نے بلوچی زبان وادب پر بڑا کام کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''پاپولر پوئٹری آف دی بلوچیز (جلد اول ۱۹۰۷ء لندن) میں بلوچی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں لکھتا ہے: ''بلوچی شاعری میں نہ تو ایرانی نمونے کی غزلیں ہیں نہ دیوانوں کی ترتیب ملتی ہے۔ بلوچی شاعری مضمون اور اظہار بیان کے اعتبار سے سادہ اور سلیس ہے اور اُن کی زندگی اور ملکی ماحول کی سچی عکاسی کرتی ہے۔ یہ عین قدرتی عمل ہے کہ بے آب و گیاہ چٹیل پہاڑوں اور ریگستانوں میں زندگی گزارنے والا شاعر ہمیشہ بارش اور بادو باراں کے طوفان کی تمنا کرتا ہے اور سرسبزی و شادابی کا آرزومند رہتا ہے..... اپنی خواہش کے مطابق خشک دریاؤں کو پانی سے لبریز دکھاتا ہے اور چٹیل میدانوں اور پہاڑوں کے بے آب و گیاہ دامنوں کو سبزہ کے قالینوں میں منتقل کر دیتا ہے اور ایسا خوب صورت نقشہ کھینچتا ہے کہ چشمِ تصور حیرت میں آجاتی ہے۔''

عام طور پر بلوچی شاعری کو سات حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ قدیم رزمیہ نظمیں

۲۔ رزمیہ نظمیں جو قدیم رزمیہ نظموں کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

۳۔ عشقیہ داستانیں

۴۔ عشقیہ گیت

۵۔ مذہبی اور اخلاقی نظمیں

۶۔ مختصر نظمیں

۷۔ زمانہ حال کی شاعری اور اس کے رجحانات۔

بلوچی کی رزمیہ شاعری پانچ صدیوں پر مشتمل ہے۔ اگر ہم زبان، طرزِ ادا اور دوسری شاعرانہ خوبیوں کو پیشِ نظر رکھیں تو اسے تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور میر چاکر رند اور میر گوہرام لاشاری کے زمانے پندرھویں صدی کے آخر سے شروع ہو کر پنجاب اور سندھ کی طرح ان کی نقل مکانی سولہویں صدی کے نصف اول پر ختم ہوتا ہے۔

دوسرا دور میر چاکر رند اور میر گوہرام کی بلوچستان سے نقل مکانی ۱۵۵۰ء کے بعد سے شروع ہو کر بلوچستان کی سرحدات پر انگریزوں کی آمد ۱۸۳۰ء کے زمانے پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرا دور بلوچستان میں انگریزوں کی آمد ۱۸۳۰ء سے ۱۹۲۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ زمانہ بلوچستان میں انگریزوں کا دورِ حکومت کہلاتا ہے۔

رزمیہ نظموں کے ساتھ ساتھ وہ نظمیں بھی اہمیت کی حامل ہیں جو بلوچوں کی ہجرت اور دوسرے تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ رزمیہ نظموں کا بیشتر حصہ رندوں، لاشاریوں اور دودیوں کی باہمی جنگوں سے متعلق ہے۔ میر چاکر رند اپنے حریف میر گوہرام لاشاری کو للکار کر کہتا ہے:

(ترجمہ) اب مرد بنو کہ

تم نے مردوں کو للکارا ہے

تم نے رندوں کے ساتھ

برا بری کا دعویٰ کیا ہے

☆

میرے ببر شیر جیسے پنجے کی

ایک چپت کنپٹی پر کھا کر

تم گھوڑی کی بچھیری کی طرح بدک کر

یوں بھاگے کہ اب تک اطرافِ عالم میں

سرگرداں بھٹکتے پھر رہے ہو

فلی کی مشہور لڑائی میں میر گوہرام نے میر چاکر کو تباہ کن شکست دی، اس لڑائی میں میر چاکر کے بڑے بڑے رند مارے گئے، اسی لڑائی میں شکست کا حوالہ دیتے ہوئے میر چاکر سے مخاطب ہو کر میر گوہرام کہتا ہے:

چاکر!

میں جو ساون کی گھٹاؤں کی طرح اُٹھا

اور طوفان بن کر تجھ پر ٹوٹ پڑا

پھر فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ تم میرا مقابلہ کیسے کر سکتے ہو جبکہ:

رندوں کا بنیادی بادشاہ میں ہی ہوں

اور میرا ہی قبیلہ بلوچوں کا نامور قبیلہ ہے۔

سمّی کا شوہر اللہ کو پیارا ہو گیا تو اُس کے اپنے قبیلے 'بلیدی' کا سردار — بی برگ پُڑ اس کی جائداد کے پیچھے پڑ گیا۔ سمّی نے اپنے خاوند کی بھیڑیں اور گائیں اس کے سپرد کر دیں لیکن اُس نے اپنی ذاتی بھیڑیں اور گائیں دینے سے انکار کر دیا جو اُس نے خود ریتلے کھیتوں اور تنگ گھاٹیوں میں تکلیفیں برداشت کر کے پالی تھیں۔ بی برگ پُڑ ان پر بھی قابض ہونا چاہتا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا سمّی اپنے مویشی ہانک کر گورگیج قبیلے کے کشادہ دل سردار دودہ خان کی پناہ میں آ گئی۔ دودہ خان نے سمّی کو مہمان کا رتبہ دیا اور اس طرح وہ سمّی کے جان و مال کا ضامن بنا۔

بی برگ پُڑ اسے برداشت نہ کر سکا اور موقع ملتے ہی سمّی کے مویشی ہانک کر لے گیا۔ سمّی نے روتے ہوئے اپنی بپتا دودہ خان کی بہادر ماں کو سنائی۔ دودہ خان کی ماں اپنے بیٹے کے پاس پہنچی۔ وہ آرام کر رہا تھا اُسے جگایا اور طنزیہ انداز میں کہا:

ترجمہ: جو بہادر لوگوں کو پناہ میں لیتے ہیں

وہ دوپہر کو یوں غافل نہیں سوتے!

یا تو سمّی کی گائیں صحیح سلامت لے آ

یا اپنی جانِ عزیز قربان کر دے!

دودہ خان گائیں تو واپس نہ لا سکا مگر اُس نے اس تلاش میں اپنی جان قربان کر دی۔ دودہ کا کم سن بھائی بالاچ چودہ سال تک اپنی مہمان خاتون سمّی، بہادر ماں اور معصوم بہن فاطمہ

سے دُور بہت دُور رہا۔ آخر کار اُس نے بدلہ لے لیا اور اُس کے اپنے قول کے مطابق وہ اپنے دشمنوں کے لیے ٹھنڈے پانی کا جھرنا نہ رہا جس سے وہ اپنی پیاس بُجھا سکیں بلکہ اُس نے دودہ پر ظلم روا رکھنے والوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جو باز کتوبر کے ساتھ کرتا ہے۔ جو تیز رَو چھوٹے چشمے کے ساتھ کرتی ہے۔ جس طرح سؤر فصلوں کو تباہ کرتا ہے جیسے بکریاں درخت کی کونپلوں کو چٹ کر جاتی ہیں جیسے بھیڑیا اونٹنی کے بچے (بوتے) کے ساتھ سلوک کرتا ہے جیسے مچھیرے مچھلی کے ساتھ۔

بزمیہ اور عشقیہ بلوچی شاعری کا محبوب مافوق الفطرت ہونے کی بجائے زمینی مخلوق دکھائی دیتا ہے۔ بعض اشعار میں مخصوص طبقے کی ثقافت کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ بلوچی کے معروف شاعر جام دُرک کی شاعری میں اونچے طبقے کی تہذیب کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اُس نے حسیناؤں کا سراپا بیان کیا ہے اور ''ڈھاڈھر کا بازار'' میں امرا کی زندگی، طور طریقہ، رہن سہن، لباس اور زیورات کو پیش کیا ہے مثلاً:

''ایک دن میں ڈھاڈر کے پُرعظمت بازار میں گیا۔

وہاں ایک خوب صورت پیکر دیکھا۔

اُس کا دامن زمین کو جھاڑو دیتا جا رہا تھا (یعنی قدیم زمانے کی شہزادیوں کی طرح اُس کا دامن زمین تک آ رہا تھا)

اُس نے اپنی زلفوں کو کنگھی سے سنوارا ہوا تھا

اور انہیں سر کے اوپر جوڑے کی شکل میں جمایا ہوا تھا''

''کل شب جو بجلی لہراتی ہوئی ادھر آئی

ایک مخمور گھوڑی کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی

وہ میرے محبوب کی خبر لائی

اور دامانِ مُراد کو پھولوں سے بھر دیا''

شہ مرید رند سردار مبارک کا بیٹا تھا۔ وہ بہادر اور نڈر تھا۔ بچپن سے اپنے چچا کی بیٹی حانی سے منسوب تھا جو اپنے عہد کی حسین ترین لڑکی تھی اور اپنی ہم جولیوں کی سرتاج اور سُبک خرام پری

کہلاتی تھی۔ میر چاکر خاں اس پر فریفتہ ہو گیا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک دن سب رند سرداروں سے اُس نے قول لیے۔ شہ مرید نے کہا کہ صبح سویرے دستِ سوال دراز کرنے والے کو وہ خالی نہیں لوٹائے گا۔ کچھ ہی دنوں بعد چاکر خان نے ایک شخص کو فقیر بنا کر شہ مرید کے پاس بھیجا اور یوں شہ مرید حانی کو ہار گیا۔ چاکر خان نے حانی سے نکاح کر لیا مگر اُس کا دل نہ جیت سکا۔ مرید فقیر بن کر حرمین شریف چلا گیا۔

حانی اپنے اردگرد پھیلے ہوئے راحت کے سامان دیکھتی اور ایک طنزیہ مسکراہٹ اُس کے لبوں پر تیر جاتی اور طنزاً پکار اٹھتی:

''میر چاکر نے پہننے کے لیے مجھے جو ریشمی ملبوسات دیے ہیں وہ میرے لیے آگ ہیں۔
اس کے دیے ہوئے زیور میرے لیے بچھو ہیں
یہ بچھو مجھے مسلسل ڈس رہے ہیں
اے دل! تو اتنا بے قرار کیوں ہے؟
تیرا مرید تو کوسوں دور مکے میں ہے''

شہ مرید کا ایک جگر پارہ ملاحظہ ہو۔ حانی کا سراپا کتنے حسین اور دل نشین پیرائے میں بیان کر رہا ہے:

میرے بابا، میرے بابا!
تم نے میری محبوب کو نہیں دیکھا
حانی چاند سے برتر ہے
کیونکہ چاند کے اندر غبار ہے
حانی دودھ سے بھی برتر ہے
کیونکہ دودھ پر جھاگ ہے
حانی کفِ دست سے بھی برتر ہے
کیونکہ کفِ دست میں لکیریں ہیں۔

بلوچی کے شعراء نے بعض ایسی تشبیہات استعمال کی ہیں جو اُردو میں مستعمل نہیں۔ جیسے محبوبہ کی کمر کو ڈیمبو یا بھڑ کی کمر کہنا، سینے کو دُمِ مار یعنی سانپ کی دُم سے تشبیہ دینا، ناک کو تلوار، تیغ یا خنجر کہنا اور خود محبوبہ کو لسہ ئیں مار یعنی ستھرا سانپ یا ایسا سانپ جس پر کینچلی یا جھلی نہ ہو، کہنا۔ محبوبہ کی گردن کو کونج کی گردن سے تشبیہ دینا۔ اکثر شعرا بلبل کی بجائے کبوتر، قُمری اور فاختہ کی خوش الحانی کو محبوبہ کے لیے بطور تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔ بیری جو نا مساعد حالات میں پل کر بڑی ہوتی ہے، کے پھل کو اپنی محبوبہ سے تشبیہ دے کر نئی بات پیدا کرتے ہیں۔ بے وفا حسینائیں صبح کے سائے کی طرح جلد چھوڑ کر چلی جاتی ہیں مست توکلی نے اپنی محبوبہ سمّو کے لیے جو تشبیہات استعمال کی ہیں۔ وہ سادہ اور عام فہم ہونے کے علاوہ بلوچوں کے بادیہ نشین معاشرے کے مطابق اور موزوں ہیں۔ گویا ہوتا ہے:

سمّو، زین (مری بگٹی علاقہ میں) پہاڑ کے
پیپل کے درختوں میں سے ایک ہے۔
یا، وہ پرندہ ہے کہ جسے مور کہتے ہیں
یا وہ تلوار ہے
جسے تازہ ابھی ابھی صیقل کیا گیا ہو۔
یا انجیر کے چوڑے پتوں والا وہ درخت ہے
جو اُونچی گھاٹیوں پر اُگتا ہے۔

قدیم بلوچی شاعری چونکہ سینہ بہ سینہ روایات کی مرہون منت رہی ہے اور ناخواندگی اور قبائلی جنگوں کے باعث لوگوں نے نعتیہ اشعار کو چھوڑ کر صرف اُن اشعار کو حفظ کیا جن کی انہیں جنگی رجز یا بزم کی ہما ہمی میں ضرورت تھی۔ اسی لیے جو تھوڑی بہت مذہبی اور اخلاقی نظمیں ملتی ہیں۔ انہیں دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں اسلامی عقائد کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی مدحت، غوث پاک اور دوسرے اولیا کی ستائش اور درویشوں کے متعلق قصے ملتے ہیں۔

کیچ مکران میں ملک دینار کی لڑائی کے بارے میں ایک نظم سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔ اُس کا پہلا شعر یہ ہے:

ترجمہ: نبی اکرمؐ سچے پیغمبر اور قُرآنِ مجید کا عملی نمونہ ہیں۔

بلوچستان کے نامور شاعر مُلا محمد حسن اپنے بلوچی اشعار کا آغاز یوں کرتے ہیں:

ترجمہ: سب سے پہلے خداوند عالم کی تعریف کرتا ہوں جو زمین و آسمان کا مالک ہے۔

ہزاروں درود و سلام نبی صلعم کے خاندان، محمد مصطفیٰؐ اور چار یاروں پر.....

بہ قول! اثیر عبداللہ قادر شاہوانی:

ترجمہ: سلام اُس پر جس کے دنیا والے فدائی ہیں۔ درود اُس پر جو ہمارا وسیلہ بن کر آیا۔

سلام اُس پر جو خیر البشر بن کر آیا۔ درود اُس پر جو ہماری شفا بن کر آیا۔

انگریزی عہد کے بلوچی شعرا میں مست توکل، حضور بخش جتوئی، جوانسال بگٹی اور محمد ان گشکوری کے کلام میں مذہبی خیالات اور تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ رحم علی مری، ملا عمر اور محمد بخش جتوئی نہ صرف آتش بیاں رزمیہ شاعر ہیں بلکہ اُن کے کلام میں طنز و مزاح کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

رحم علی مری عوامی اور قومی شاعر تھا۔ جب اُس نے بلوچ سرداروں کو انگریزوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتے دیکھا تو طنزیہ انداز میں کہا:

ترجمہ: فرنگی حکومت بہ تدریج درخت کی طرح اُگتی گئی

(فرنگی حکومت کے ارتقا کو شجر کو نشو و نما سے تشبیہ دینا رحم علی کا ہی حصہ ہے)

چغل خور (غدار) اُسے راستہ دکھاتے ہوئے لائے

یہ بے حمیت لوگ اُس کی رہنمائی کرتے تھے

(افسوس) وطن سے مسلمانی ختم ہوگئی

اور سانپ (کافر) ہم سے لپٹتا گیا!

غیرت بھاگ کھڑی ہوئی اور

پلٹ کر حیا سے کہنے لگی

میں تو جا رہی ہوں

تو بھی میرے نقش قدم پر خاموشی سے چلی آ

مختصر نظموں میں لولیاں (لوریاں) دَستانغ (موجودہ عشقیہ غزلیں) منظوم پہیلیاں اور لطیفے شامل ہیں۔ لولی (لوری) میں ماں بلوچی معاشرے کے مطابق اپنے بیٹے کو بہادروں اور جنگجوؤں کا سردار دیکھنا چاہتی ہے۔ دَستانغ مختصر ہوتے ہیں لیکن محبت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ منظوم پہیلیاں اور لطیفے بلوچی زبان کا خاص حصہ ہیں اور بلوچ اُن سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بلوچی لوک گیتوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جیسے نازنگ: یہ گیت شادی یا منگنی کے موقع پر بہن گاتی ہے۔ اس میں وہ اپنے بھائی کے حسن و جمال کی تعریف بھی کرتی ہے اور بہادری کے گن بھی گاتی ہے۔ دلہن کی سہیلیاں نازنگ میں دولہا کی فرضی کمزوریوں کا ذکر کر کے از راہ شوخی و تفنن اس کی خوب گت بناتی ہیں۔ اس اعتبار سے نازنگ کا موضوع ان پنجابی لوک گیتوں سے ملتا ہے جو سٹھنیاں کہلاتے ہیں۔ یہ گیت صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر بھی گائے جاتے ہیں۔

سپت: لفظ صفت سے اثر پذیر ہے۔ یہ عام طور پر حمدیہ، نعتیہ اور مناقب سے متعلق مضامین پر مبنی ہوتا ہے۔ اسے بچے کی پیدائش پر کئی کئی راتوں تک زچہ کی خاطر گاتے ہیں۔ مکران کا یہ مرغوب لوک گیت عموماً ایک یا دو شعروں پر مشتمل ہوتا ہے جیسے:

پھول سا بچہ مرا	پاسبان اُس کا خدا
پاسبان اُس کا خدا	اس پہ ہو ظل اللہ

کہا جاتا ہے کہ بلوچوں نے اپنی شاعری میں بیرونی اثرات کو دخل نہیں دینے دیا۔ لیکن خود اپنی ایک مخصوص نہج پر بھی قائم نہیں رہے۔ بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں مثلاً نئے جنگی ہتھیار اور آلہ جات کا ذکر وغیرہ۔

۱۹۲۰ء کے بعد سے اب تک بلوچی شاعر اُردو اور فارسی شاعروں کے رجحانات سے اثر پذیر ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اردو غزل اور کافی کے انداز کو اپناتے ہیں لیکن اُسے بلوچی رنگ دے دیتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد بلوچی زبان و ادب کی پیش رفت کے لیے سرکاری اور نجی سطح پر اچھی خاصی کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اس میں ریڈیو پاکستان (بلوچی سیکشن) کی سرپرستی بھی ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ خاص کر نثری ادب کی تخلیق کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن بہت زیادہ مدد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ اکثر و بیشتر فیچر، ڈرامے اور تقریریں وہاں سے براڈ کاسٹ ہوتی ہیں۔ اور ناظرین مختلف پروگرام دیکھتے ہیں۔ اس پیشرفت میں نوکیں دور کوئٹہ، بلوچی زمانہ کراچی، بلوچی زمانہ کوئٹہ، صدائے بلوچ کراچی، بلوچی دنیا ملتان، سوغات کراچی، اومان کراچی اور اولس کوئٹہ (جاری کردہ محکمہ اطلاعات، حکومت پاکستان) کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ کامل القادری (مولف مہمات بلوچستان جلد اوّل، دوم، لاہور ۱۹۸۰ء) کی تحقیق کے مطابق بلوچی کو جدید شعراء کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے اور تازہ واردان بساطِ ہوائے دل بھی خوب کہہ رہے ہیں۔ بلوچی زبان کا بیش قیمت سرمایہ شعری ادب پر مبنی ہے۔ اب تک نثر ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے۔ غیر تحریری لوک کہانیاں اور داستانیں جو قبائلی گویوں اور فسانہ خوانوں کے حافظے سے اکٹھے کیے گئے ہیں وہ ایک خاص فضا کے مالک ہیں اور لسانی اعتبار سے انہیں صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ان ذرائع سے یکجا کردہ لوک کہانیوں کے چند مجموعے ''گیدی قصہ'' کے عنوان سے بلوچی اکادمی (کوئٹہ) نے شائع کر دیے ہیں۔ غیر تحریری نثری ادب کے بعد مکتبہ درخانی نے نثری ادب کی طرف باشعور کوشش کی تھی۔ قصہ یوں ہوا کہ ''بائبل سوسائٹی پنجاب'' لاہور نے انجیل مقدس کا ایک حصہ ''یوحنا'' کا بلوچی زبان میں ترجمہ کیا۔ اُن کا مقصد اپنے مذہب کا پرچار تھا۔ مولانا محمد فاضل درخانی رئیسانی پہلے ہی درخان (ڈھاڈر ضلع کچھی۔ سبی ڈویژن) میں تبلیغ و اشاعت دین کے لیے ایک دینی مدرسہ قائم کیے ہوئے تھے۔ اسی

مدرسے سے برا ہوئی اور بلوچی زبانوں میں مطبوعات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ تین ساڑھے تین سو کے لگ بھگ کتابیں شائع ہوئیں۔ مولانا حضور بخش جتوئی نے قرآن کریم کا ترجمہ صاف و شستہ بلوچی زبان میں کیا۔ مولانا محمد عمر دین پوری نے قرآن مجید کا ترجمہ فصیح و بلیغ براہوئی زبان میں کیا۔

بعدازاں مولانا عبدالصمد سربازی نے خان معظم میر احمد یار خان مرحوم کے ایماء پر قرآن حکیم کا ترجمہ بلوچی میں کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی زندگی میں صرف بیس پاروں کا ترجمہ مکمل کر سکے۔ جو 'سوغات' کراچی میں شائع ہوا ہے۔ ''رسولؐ ئے پہکیں (زند)'' (کوئٹہ ۱۹۸۰ء) کے مولف بلوچی کے معروف ادیب حاجی عبدالقیوم بلوچ بھی محنتِ شاقہ کے ساتھ قرآن پاک کا بلوچی میں ترجمہ اور تشریح کر چکے ہیں جو زیرِ طبع ہے۔

موجودہ دور کے بعض بلوچی شعراء بھی بلوچی کے اچھے نثر نگار ہیں مثلاً گل خان نصیر، میر عیسیٰ خان قومی، اکبر بارکزئی، مولانا منیب، مولانا عبدالصمد سربازی، عطا شاد وغیرہ قابل توجہ انشا پرداز ہیں۔ عبدالکریم شورش، آزاد جمالدینی، غوث بخش صابر، انور ساجدی شاداں اچھے صحافی ہیں، انور شاہ قطانی، سید ہاشمی افسانہ نگاری اور انشا پردازی میں بھی ایک مقام رکھتے ہیں۔ قاضی عبدالرحیم صابر نے حضور پاک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بلوچی میں پہلی کتاب ''دو جہان ءِ سردارؐ'' (کراچی، ۱۹۶۶ء) تحریر کی۔

اسی ضمن کی دوسری کتاب ''سیرت النبیؐ (کوئٹہ ۱۹۸۱ء) میر مٹھا خان مری کی شائع ہوئی ہے۔ دو اور کتابیں چھپی ہیں۔ ''پاکیں نبی ء زند، میر محمد خان بلوچ، کوئٹہ ۱۹۸۰ء پاکیں نبی ءِ صلی اللہ علیہ وسلم نسب تانگ'' آغا میر نصیر خان اخدرکی، اسلام آباد ۱۹۸۵ء۔ چند دیگر مشہور نثر نگار ہیں: بشیر احمد بلوچ، میر خدا بخش مری، خیر محمد بلوچ ندوی، میر محمد سردار خان بلوچ، شیر محمد خان مری، صورت خان مری، (آپ نے اور میر مٹھا خان مری نے مل کر ایک لغت بلوچی، اُردو مرتب کی ہے) عاقل خان مینگل، عصمت اللہ خان جمالدینی، کریم دشتی، محمد بیگ بلوچ، ملک محمد پناہ، عزیز محمد بگٹی، عبدالغفار ندیم، عبدالصمد امیری، امان اللہ گچکی، محمد یوسف گچکی، عبدالغفار گچکی،

غلام نبی شیرازی، ملک محمد رمضان، گلزار مری، محمود مری، اثیر عبدالقادر شاہوانی وغیرہ۔

بلوچستان یونیورسٹی نے پہلے بلوچی زبان کے امتحانات ''ادیب، عالم اور فاضل'' کا بندوبست کیا۔ ساتھ ہی ساتھ تدریس کا بھی اہتمام ہوا۔ اب ایم۔ اے تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے اب نثری کتابوں کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے۔ اُردو میں بھی بلوچی ادب سے متعلق بعض کتابیں مثلاً (بلوچی ادب سلیم خان گمی، لاہور ۱۹۶۰ء، ثقافت اور ادب وادی بولان میں (بلوچی ادب میر مٹھا خان مری) کوئٹہ ۱۹۶۶ء، آئینہ بلوچ، پروفیسر انور رومان، ملتان ۱۹۶۴ء، بلوچی رزمیہ شاعری، بلوچی عشقیہ شاعری، میر گل خان نصیر، کوئٹہ ۱۹۷۹ء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک بلوچستان میں، ڈاکٹر انعام الحق کوثر (بلوچی کتب اور نعت گوئی لاہور، ۱۹۸۳ء) سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی مہک بلوچستان میں، ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر بلوچی کتب اور نعت گوئی، کوئٹہ ۱۹۹۷ء سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی اکیسویں صدی میں، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر بلوچستان میں پاکستانی زبانوں براہوئی، بلوچی اور پشتو میں تذکرہ سیرت، کراچی ۲۰۰۱ء، بلوچستان میں دینی ادب (ہر باب میں فارسی، اردو، پشتو، براہوئی اور بلوچی کتب کا ذکر) قلمی، کوئٹہ ۱۹۸۷ء (پی، ایچ، ڈی کا مقالہ برائے سندھ یونیورسٹی جامشورو) چھپی ہیں۔

بلوچی ادب کا یہ ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کارواں رنگ و بو روز بروز ترقی پذیر ہے۔ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ انشاء پردازی، افسانہ نگاری، تنقید نگاری اور انشائیہ نگاری کے وسیع اور متنوع تجربات کیے جا رہے ہیں۔ اس وقت اڑھائی تین سو شعراء اور ادباء بلوچی زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ بہ قول قاضی عبدالرحیم صابر:

ترجمہ: دیکھیے آج ہر جگہ ہماری عزت قائم ہے
اور ہم سر اٹھا کر فخر کرتے ہیں
اپنے وطن اور اپنی عسکری قوت پر

پھر کیوں مزدور اور دہقان خوشی سے سرشار نہ ہوں
قدم بڑھاؤ کہ منزل دور نہیں ہے

ترانہ (پاکستان)

تیری شان اونچی ہو
اور ہر چیز تجھ پر نثار ہو
امن اور خوشحالی کے ساتھ
ہر انسان ایام بسر کرے
اے پاکستان اے نشانِ اسلام
تیرا پشت و پناہ رحمٰن ہو

☆☆☆